**Majallah Tahqiq**
Research Journal of the
Faculty of Oriental Learning
Vol: 39, Sr.No.112, 2018 pp 05 - 14

مجلہ تحقیق
مجلہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۹، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۸ء، شمارہ ۱۱۲

# اقبال کا تصورِ انسان

☆ڈاکٹر روبینہ یاسمین

**Abstract:**

The following research article is a humble attempt to explore Iqbal's concept of man in the perspective of Eastern and Western view points. Iqbal's 'Man' is the perfect man who has also been sought after in Western philosophies since long. However, the 'Superman' of West occupies physical vigour only and is devoid of the quest for the nourishment of soul altogether. In their expedition for the attainment of the zenith of material progress, Western philosophy deviated away from spiritual glory and culminated in a society with inner hollowness. On the other hand, Iqbal's concept of man is focused upon the perfection of mental as well as spiritual uplift of man irrespective of gender discrimination.

سائنس اور سائنسی رجحان نے مغرب میں اتنی ترقی کہ مابعد الطبیعات کو طبیعات نے پیچھے چھوڑ دیا اور طبیعات کی روشنی میں انسان کا مقام طے ہونے لگا۔ نئے فلسفے میں یہ چیز زیادہ اہم تھی کہ انسان کیا ہے؟ اُس کا وجود کیسے ہے؟ اُس کے افکار و خیالات کیسے ڈھلتے ہیں اور انسان کا مختلف حالات میں ردِّ عمل مختلف کیوں ہے؟ انسان ذہنی ترقی کے مختلف مدارج کیسے طے کرتا ہے؟ کیا انسان اپنے آباواجداد سے بہتر ہے یا بہتری کی طرف جارہا ہے؟ ظاہر ہے ان سوالات کا جواب نفی میں نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ انسان مادی لحاظ سے اپنے آباواجداد سے کہیں بہتر ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا انسان صرف مادہ ہے۔ کائنات حیات میں کیا وہ بھی بے جان چیزوں کی طرح صرف ترقی کر رہا ہے یا کہ اُس کے ذہن اور روح میں

☆ گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، سرگودھا

بھی روشنی آ سکتی ہے۔ کیا وہ صرف اپنے جسم کو شناخت کر رہا ہے؟ وہ صرف اپنا DNA جانتا ہے۔ اپنی روح کی بالیدگی کی طرف بھی متوجہ ہے یا نہیں؟ اُس کا عقیدہ اور روح بھی جسمانی ترقی کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کر رہے ہیں یا نہیں۔ جب روحانی ترقی کا سوال اُبھرتا ہے تو جدید مادی انسان اندر سے کھوکھلا ہے۔ وہ سکون کا متلاشی ہے ایک ایسے مرکز کا طلب گار ہے جو اُس کی بے قراری کو قرار دے مگر مادی سلطنتوں میں یہ نا ممکن ہے۔ یہیں سے انسان کے مختلف تصورات نے جنم لیا اور فلسفہ دانوں نے اپنی ترجیحات و توضیحات کے ساتھ انسان کے تصور کی تشریح کی۔ ہائیڈگر نے Authentic Individual کا نظریہ پیش کیا کہ آدمی کا وجود ہی سب کچھ ہے اور وہ خود ہی اہم ہے۔ عقیدے اور باطن سب گئے وقتوں کی بات ہے۔

اقبال مشرقی فلسفہ کے دلدادہ تھے اور مشرقی تہذیب کی خوبیوں کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان میں پیدا ہونے والے سقم سے بھی بہ خوبی واقف تھے پھر مشرق میں مذہب کے حوالے سے انسان کا تصور موجود ہے۔ اقبال بھی عقیدے اور انسان کو علیحدہ نہیں کرتے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ورنہ انسانی روح بالیدگی کی انتہا کو نہیں چھو سکتی، اُس کا ایک پہلو تشنہ رہ جاتا ہے کیوں کہ انسان صرف عناصر کا مجموعہ نہیں بلکہ اُس میں زندگی، جذبے اور خیال سے آتی ہے۔ جذبہ اور خیال کو الگ کر کے انسان ایک مشین تو بن سکتا ہے مگر انسانیت کی بلندیوں کو چھونے سے قاصر رہتا ہے۔ جب صرف حواس اور مادے کا مجموعہ انسان یورپ کے سامنے آیا اور اس کے خوفناک نتائج صرف مادی ہوس، خواہشات کی غلامی اور حصولِ اقتدار کے لیے دوسروں کا حق چھیننا جیسے مسائل سامنے آئے تو مغربی مفکرین جس انسان کو مادیت میں کھو چکے تھے، وجودیت میں اُس کو تلاش کرنے کی سعی لاحاصل کی۔

بعض مفکرین نے انسان کو مجموعہ اضداد کہا تو بعض نے زندگی کو ہی لغو قرار دے دیا۔ یہاں خدا کی ہستی کے وجودی منکرین اور خدا کے قائل وجودی دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور صاحبِ یقین فرد یا انسان کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں جبکہ اصل قصہ ایمان کی بحالی کا ہے۔ جب تک انسان کو خدا اور کائنات کے تناظر میں نہیں دیکھا یا پرکھا جاتا، عقل انسانی فکر کی بند گلیوں میں گردش کرتی رہے گی۔ انسانیت نوازی (Humanism) جذباتی اپیل ضرور ہے مگر اصل مرکز پھر بھی انسان ہے۔ انسان، خدا اور کائنات میں ربط ہونا ضروری ہے۔

انسان کے متعلق علامہ اقبال کا تصور قرآن سے ماخوذ ہے اور یہ تصورِ انسان علامہ نے خودی کے نظریے سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''قرآنی الفاظ میں عبد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر اقبال کے نزدیک عبد سے مراد عام صاحب ایمان انسان اور عبدہ سے مراد حضور سرورِ کائنات ؐ کی ذاتِ مبارک ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ لازمی ہے کہ اقبال کے ہاں انسان کامل کا جو تصور ہے وہ ابنِ عربی کے تصور

انسان الکامل اور نطشے کے فوق البشر سے ماخوذ ہے۔ یہ کارلائل کے ہیرو سے بھی مختلف ہے Chrismatic Person سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اقبال کے ہاں محض عبد بھی یقین و ایمان کی توانائی سے اوپر اُٹھتا اور اطاعتِ نفس اور ضبطِ نفس کے ذریعے نائب حق کے منصب پر فائز ہو کر ستاروں سے بھی آگے بڑھ جانے کی آرزو رکھتا ہے۔''(۱)

اقبال نے قرآن سے ماخوذ وہ منظر بالِ جبریل میں بیان کیا ہے جب فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کر رہے تھے تو انسانی فضیلت کا یہ گیت اُن کی زبان پر تھا۔

''عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و ماہتابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی''(۲)

کلامِ اقبال میں انسان مرکزِ نگاہ ہے بلکہ اقبال کا موضوع ہی انسان ہے۔ وہ خدا کی بات بھی انسان کے حوالے سے ہی کرتے ہیں اور کائنات کی تفسیر تو ہے ہی انسانی مقاصد کے تابع۔ اس لحاظ سے اقبال کو انسان شناسی کا ایک بڑا منبع قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اُن کی خدا شناسی بھی انسان شناسی سے ہی متعلق ہے۔ اقبال نے انسانیت کے مسائل کو حل کرنا اپنی شاعری کا مقصد قرار دیا۔ اقبال کے تصورِ انسان کے بارے میں ممتاز شیریں کی رائے دیکھیں:

''اقبال نے دراصل انسان کے اسلامی تصور ہی کو اپنایا ہے۔ صوفیوں کے اس تصور کے بر خلاف کہ خودی کو مٹا کر اپنے آپ کو وجودِ مطلق میں جذب کر دینا انسان کی آخری منزل اور تکمیل ہے۔ اقبال نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ انسان اس مکمل اور یکتا وجود کے جتنا قریب آتا ہے اُس کی تکمیل کی منزل اتنی ہی قریب ہے۔ حتیٰ کہ ''انسان کامل'' وہ ہے جو بجائے خودی کو مٹا کر خدا کی ہستی میں جذب ہونے کے، اپنے آپ میں خدا کی ہستی کو جذب کر لے۔''(۳)

اقبال انسان کو حقیر نہیں سمجھتے نہ ہی اُسے قوتِ عملی سے محروم سمجھتے ہیں بلکہ اُسے انفرادیت کا علمبردار کہتے ہیں اور اپنی ہستی کی قدر و قیمت کو پہچاننے کی تلقین کرتے ہوئے کائنات کو مسخر کرنے کا فریضہ بھی سونپتے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور تو اقبال کے انسان کو ''خدا کے مشن کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مشن کی خاطر دنیا اور اس کے کاروبارِ شوق سے اُس کا انہماک ضروری ہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

قصور وار غریب الدّیار ہوں لیکن
مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
تیرا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
اُنھی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد(۴)

اگر انسان خود کو فراموش کرے دے تو پھر اپنی صلاحیتوں کو کیسے پہچانے گا اور خود پر یقین نہ ہو تو اُس میں اعتماد ذات کیسے ہوگا۔ اقبال خودی کو انسانی کمال کا درجہ دیتے ہیں کیوں کہ اس کے بغیر انسان زندگی کے اعلیٰ وارفع مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ انسان میں قدرتی طور پر یہ جذبہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو دوسروں سے ممتاز کرنا چاہتا ہے اور یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسان کو اپنی ہستی اور صلاحیتوں پر یقین نہ ہو کیوں کہ خودی کے ذریعے انسان زمین و آسمان پر چھا سکتا ہے اور اپنے وجود کے مقصد کو پا سکتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب اقبال کے نظریۂ خودی سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کا فلسفہ خودی نہ تو کوئی دینی فلسفہ تھا اور نہ ہی کوئی روحانی فلسفہ تھا۔ یہ سراسر ایک دنیاوی تخیل تھا جو برصغیر میں ایک خاص دور میں مسلمانوں کو انگریزوں اور غیر مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی برتری کے مقابلے میں ابھارنے کے لیے غالباً الہامی طور پر علامہ کی شاعری پر نازل ہوا، ورنہ عبد کی معراج خودی نہیں فنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں انسان کی نہ کوئی انفرادیت ہے نہ کوئی EGO۔''(۵)

خودی کو محکم کرنے کے لیے اقبال عشق کا درس دیتے ہیں کیونکہ عشق ایک اعلیٰ جذبہ ہے جو ایمان سے پیدا ہوتا اور ساری رکاوٹوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے جبکہ عقل شکوک و شبہات کا نام ہے۔ عقل ابلیس کی خصوصیت ہے اور عشق آدم کی۔ عشق سے انسان کو حیاتِ جاوید نصیب ہوتی ہے، اگر خودی ایک جسم ہے تو عشق اس جسم کی روح ہے۔ اقبال عشق کی پذیرائی یوں کرتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی(۶)

عشق انسان کو بے خطر کر دیتا ہے جب کہ عقل اُسے خوف زدہ کر دیتی ہے اور خوف سے انسان اعلیٰ مقاصد کی طرف نہیں بڑھتا بلکہ وسوسوں میں گھر کر اپنی صلاحیتوں کا استعمال نہیں کر سکتا۔ اقبال عشق کو عقل کی ترقی یافتہ شکل سمجھتے ہیں کہ عقل کے بغیر عشق ممکن نہیں۔ خرد کی گتھیاں سلجھانے سے پہلے انسان صاحب جنوں

نہیں ہوسکتا کیونکہ عشق کی منزل عقل کے بعد آتی ہے۔ عقل ہمیں راہ دکھاتی ہے جب کہ عشق منزل تک ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولیٰ مجھے صاحبِ جنوں کر(۷)

اقبال ایسے انسانِ کامل کی آرزو رکھتا ہے جو اپنی نگاہ کے سحر سے جہانِ نو پیدا کرے، اقبال کے انسانِ کامل اور پروفیسر میکزی کے صاحبِ جنوں میں ایک مشابہت ہے۔ پروفیسر میکزی اپنے صاحبِ جنوں کی ضرورت یوں بیان کرتے ہیں:

''کوئی اعلیٰ جماعت اُس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اعلیٰ افراد نہ ہوں اور ان کو پیدائش کے لیے صرف وقت نظر ہی درکار نہیں بلکہ قوتِ متحرکہ بھی، صرف روشنی ہی نہیں بلکہ آگ بھی درکار ہے۔ موجودہ مسائلِ معاشرت کو محض نظری حیثیت سمجھ لینا ہمارے درد کا درماں نہیں ہوسکتا۔ اس وقت ضرورت صرف علماء مصلحین ہی کی نہیں بلکہ رہبروں کی بھی ہے۔ ایسے رہبر جیسے کارلائل، رسکن اور ٹالسٹائے جو ہمارے ضمیر کو زیادہ سخت اور ادائے فرض پر زیادہ مستعد بنا سکیں بلکہ ضرورت تو ہمیں ایک جدید مسیح کی ہے۔ یہ قول بالکل صحیح ہے کہ اس جدید رہبر کو عملی دنیا کا رہبر ہونا چاہیے تاکہ اس کا پیغام صدا بہ صحرا ہو کر نہ رہ جائے۔ دورِ حاضر کا صحرا ہمارے گنجان شہروں کی سڑکیں ہیں اور وہ مسلسل کاربات جن کے ذریعے ہم فلاح کی راہ ڈھونڈتے ہیں۔ اس رہبری کی آواز کو ان جگہوں میں پہنچنا چاہیے۔''(۸)

اقبال کا بھی یہ خیال تھا کہ خاندانِ انسانیت کی باہمی رقابت، دشمنی، تنازعات اور خانہ جنگیوں کا استیصال، معاہدوں اور صلح ناموں سے ممکن نہیں۔ اگر ان عالمگیر بیماریوں سے کوئی شے شفاء کلی بخش سکتی ہے تو وہ ایک ایسے حکیم و عارف کا وجود ہے جو اپنی شخصیت سے دلوں میں محبت و مودت کا ایسا جذبہ پیدا کردے جو زوال آشنا نہ ہو۔

اقبال نے مشرق و مغرب کے پیمانے دیکھ لیے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کی ویرانیاں اور بربادیاں بھی اُن کے پیشِ نظر تھیں اور دوسری جنگِ عظیم کے بادل بھی منڈلا رہے تھے کیوں کہ انسان رنگ و نسل اور قوم و وطن کے جھگڑوں میں انسان سے نفرت کرنے لگا تھا اور نفرت کی یہی آگ جنگ کے شعلوں کو ہوا دے رہی تھی۔ اس لیے وہ تمام قوموں کو اسلام کی تعلیمات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ اسلام رنگ و نسل اور وطنیت کے بتوں کو توڑ دیتا ہے اور تمام بنی نوع انسان کو مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات عالمگیر ہیں اور تمام جہانوں کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اور قرآن کو تمام بنی نوع انسان کے لیے ہدایت قرار دیا ہے۔ اقبال کے ہاں انسان کی بقا کا راز احترامِ انسانیت میں ہے جب تک دنیا کی علمی قوتیں احترامِ انسانیت پر اپنی توجہ مرکوز نہ کریں گی یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے

گی۔ اقبال کہتے ہیں:

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں، ترجمان تیرا ہے یا میرا

''صوفی تبسم سے مظفر علی سید نے پوچھا کہ ''یہ حرفِ شیریں سے کیا مراد ہے؟ تو کہا کہ قرآنِ مجید۔ کس طرح؟ تو بتایا کہ یہ کا لفظ اشارہ قریب جو قریب ترین اسم کی طرف راجع ہوتا ہے لیکن یہ 'مگر' کیوں؟ اور قرآن کریم کو کیا انسان کا ترجمان کہا جا سکتا ہے؟ کہنے لگے میرے نزدیک اقبال کا یہی مفہوم تھا۔''(۹)

اسلام کی عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی ہمدردی ہی موجودہ نفرت و حقارت اور برتری کا کامل علاج ہے کہ جہاں تعصب اور تنگ نظری کی دھوپ میں محبت اور اخوت کے درخت نہیں پھلتے پھولتے۔ جہاں مساوات انسانی پر یقین پختہ ہو محبت کے بیج اُسی سرزمین میں بار آور ہوتے ہیں۔ اقبال نسلی امتیاز اور آقا و غلام کی تمیز کو مٹا دینا چاہتے ہیں کہ یہی تمیز فسادِ آدمیت ہے۔ ایسی فضا اتحاد و اتفاق کی ہو جس میں ہر فرد اپنے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں دنیا کی عام ترقی و خوشی میں صرف کرے اور انسانوں کی طاقت ایک دوسرے کو مغلوب و محکوم کرنے کی بجائے انسانیت کی خدمت میں صرف ہو۔ اقبال رواداری اور خودی میں گہرا ربط دیکھتے ہیں کیونکہ اُن کے یہاں رواداری سے خودی کا وجود قائم رہتا ہے اور رواداری اور برداشت کا جذبہ بذاتِ خود طاقت سے جنم لیتا ہے، یہ کمزوری نہیں طاقت کی علامت ہے۔ اقبال رواداری کے متعلق کہتے ہیں:

حرفِ بد را برلب آوردن خطا ست
کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست
آدمیت احترامِ آدمی
با خبر شو از مقامِ آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

ترجمہ:

بُری بات ہونٹوں پہ لانا خطا ہے
کافر ہو یا مومن سب اللہ کی مخلوق ہے
انسانیت انسان کے احترام کا نام ہے

عشق کا بندہ اللہ سے رہنمائی لیتا ہے
وہ کافروں اور مومنوں دونوں پر یکساں شفقت کرتا ہے

اقبال کے تصورِ انسان کا پیکر روادار ہے اور نرم دمِ گفتگو کے مصداق مخلوقِ خدا پر رحم اور تمام انسانیت کا احترام کرتا ہے اور اُس میں تفریق نہیں کرتا۔ ڈاکٹر سعادت سعید، اقبال کے تصورِ انسان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی میں فلسفی شاعر نے انسان، کائنات اور معاشرت کے تناظر میں جس فوق البشر کی حد بندی کی وہ ایسی آزادی کا خواہاں تھا کہ جس میں وہ سر اُٹھا کر اپنی خودی کی حفاظت کر سکے۔ اقبال چاہتے تھے کہ انسان صرف اور صرف ہستی برتر کے سامنے سر بسجود ہو اور دنیاوی بتوں اور حرص و ہوس کو چھوڑ کر عزت و آبرو سے جینا سیکھے۔''(۱۰)

اگر انسان اپنی خودی سے آشنا ہو تو وہ دوسروں کے حکم اور طاقت کو تسلیم نہیں کرتا اور اسی کا نام بغاوت ہے۔ جو شخص غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا وہ لکیر کا فقیر ہے۔ اُس میں نہ تو قوتِ فیصلہ ہوتی ہے نہ جرأتِ رندانہ۔ اقبال تقلید کو خودکشی قرار دیتے ہیں اور زمانے کے نئے انداز کو نئے زاویے سے سمجھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ دوسرے انسانوں سے نرمی اور رواداری کا سبق دیتے ہیں اور انسانوں سے بلاامتیازِ رنگ و نسل محبت کا درس دیتے ہیں۔ سعید احمد رفیق، اقبال کے نظریہ اخلاق میں رواداری پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''اقبال کے ہاں رواداری اپنے خیالات و عقائد اور نصب العین پر محکم یقین رکھتے ہوئے دوسروں کو ان کے خیالات اور افعال میں آزادی دینا ہے۔ اصل رواداری کا سرچشمہ کمزوری نہیں قوت ہے اقبال اسی قسم کی رواداری کے قائل ہیں جس کی اساس قوت اور طاقت ہو۔ وہ رواداری جس کی بنا کمزوری ہو یا لالچ ہو اقبال کی نگاہ میں مردود ہے۔۔۔ حقیقی رواداری عقلی اور روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔''(۱۱)

وحشیانہ مذہبی تعصب جب عشق کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے تو ظلم کو رحمت اور ناانصافی کو عدل سمجھ لیتا ہے۔ اقبال انسان کو فقر کی دولت سے بھی مالا مال دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ جب انسان فقر کی قدر سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ انسانیت کی سطح سے گر کر غلام بن جاتا ہے۔ چاہے یہ غلامی سیاسی ہو یا خواہشات کی غلامی۔ اقبال نے شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ کے طور پر استعمال نہیں کی بلکہ اس لیے استعمال کی ہے کہ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہ خوددار ہے، کسی کا کیا ہوا شکار نہیں کھاتا، فقیر ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا، تیز نگاہ اور بلند پرواز ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہمہ ناز بے نیازی، ہمہ ساز بے نوائی
دل شاہ لرزہ گیرد زگدائے بے نیازے

بلند عزم انسان کو تسخیر فطرت پر آمادہ کرتا ہے تو تیز نگاہی روشن ضمیری بن جاتی ہے۔ اخوت اور محبت کا

پیکر یہ انسان ایک مکمل انسان کی تصویر ہے۔اس مثالی اور مکمل انسان کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اقبال کا یہ تصورِ انسان مثالی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ عملی دنیا میں اتنا جامع اور مکمل انسان نہ مل سکتا ہے اور نہ بن سکتا ہے۔اس کے باوجود یہ کہنا ممکن ہے کہ اقبال کا پسندیدہ انسان نایاب نہیں اور ایسا انسان بننے کی آرزو غلط اور بے جواز نہیں۔ایک نئی دنیا کی آرزو اور ایک نئے آدم کی تلاش ادب وفکر کی دنیا کی دیرینہ آرزو ہے۔تاریخ کے ہر دور میں مفکروں اور ادیبوں نے اس دریافت کے لیے ناول اور ڈرامے لکھے اور نظمیں مرتب کیں اور اُن کے اِن تصورات کا ذہنِ انسانی پر گہرا اثر ہوا اور تبدیلی وتخلیق آدم نو کی آرزو سے علمی طور پر نئے آدمی بھی پیدا ہوئے۔فشٹے، روسو اور ٹالسٹائے نے جس قسم کے انسان پیدا کرنے کی آرزو کی تھی ویسے انسان محدود پیمانے پر ہی سہی مگر پیدا ہو کر رہے۔''(۱۲)

ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال ''انسان اور بزمِ قدرت'' جو کہ بانگِ درا کے حصہ اوّل میں شامل ہے انسان کی ذات وحقیقت کا پورا عرفان رکھتے ہیں کہ

''جس پر خالق کو بھی ہو ناز وہ انسان ہوں میں''

کا نعرہ مستانہ آغاز تھا مگر اُس کی انتہا شوقِ سفر اور جنونِ پرواز میں ہے کہ جہاں عقل کی رسائی اور فرزانگی ہمت کھو دیتی ہے وہاں انسان پرخطر مقام سے عشق کی بدولت گزر کر انسانی ذات کے سب سے بلند مقام مردِ کامل تک جا پہنچتا ہے۔اقبال فرماتے ہیں:

تری آگ اس خاکداں سے نہیں جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

اقبال ایک آفاقی انسان اور عالمی برادری کے قائل ہیں۔اس آفاقی انسان کو وہ سورج سے تشبیہ دیتے ہیں جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے مگر اس کی روشنی سے پورا آفاق منوّر رہوتا ہے۔اقبال کے فلسفے کا ماحصل انسان اور اس کی عظمت کا گہرا شعور ہے۔عظمت انسان کا سب سے بلند تصور اس شعر میں سمجھا جاتا ہے۔

دردشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ڈاکٹر عبدالحق، اقبال کے تصورِ انسان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

میرے خیال میں ارمغانِ حجاز کی اس رباعی سے اعلیٰ ترین احساس کلام اقبال میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتا جس کی انتہا یہ ہے کہ انسان خدا کی تلاش میں نہیں بلکہ خود خالقِ کائنات اُس کی تلاش میں سرگرداں ہے

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور کہ جاں تو زخود نا محرم ہست
قدم در جستجوی آدم زن خدا خود در تلاش آدم ہست(۱۳)

اقبال نے عورت کو بھی انسانیت کے رتبے پر رکھا ہے۔ وہ عام فلسفیوں کی طرح اُسے کارزارِ حیات سے باہر رکھنے کے خلاف ہیں مگر اُن کے یہاں عورت کا وہ مقام ہے جو اسلام سے ماخوذ ہے کہ وہ سیاست و معشیت کی گتھیاں سلجھانے کی بجائے پرورشِ اولاد پر توجہ صرف کرے کیونکہ مغرب نے آزادی کے نام پر عورت کو معیشت کے شکنجے میں جکڑ کر در پردہ اُس کی آزادی اور حق کو سلب کر لیا ہے۔ وہ بچے بھی پیدا کرتی ہے اور اُن کے اخراجات کے لیے کمائی بھی کرتی ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ عورت گھریلو امور اور تربیت اولاد پر اپنی توجہ کرے اور کمانے کا کام گھر کے سربراہ کے سپرد رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت اور مرد برابر حیثیت رکھتے ہیں لیکن دونوں کے جسمانی وجود کی طرح فرائض اور کردار میں نمایاں فرق ہے۔ مغربی معاشرہ میں عورت کو برابر کا درجہ دینے کے پسِ پردہ اُس کا معاشی استحصال کیا گیا ہے۔ رشید احمد انگوی لکھتے ہیں:

''فرنگی معاشرہ اپنی اصل کے لحاظ سے قانونِ فطرت کا باغی معاشرہ ہے اور اس باغیانہ روش پر تشکیل دیا گیا معاشرتی، سماجی، مجلسی اور معاشی ڈھانچہ بڑی حد تک مجرمانہ بے اعتدالی کا مظہر ہے۔ اُس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے نسوانی حصہ کے بارے میں عملی اور نظری طور پر ظلم کا مرتکب ہوا ہے۔ وہ اس طرح کہ اُس نے فطرت کی جانب سے عطا کردہ مراعات کے مستحق نسوانی حصہ کو اُن مراعات، آرام، معاشرتی و معاشی، حقوق و تحفظ سے محروم کر دیا ہے۔'' (۱۴)

مغرب نے عورت کا جنسی، معاشی اور معاشرتی استحصال کیا ہے۔ معیشت کا دوسرا پہیہ بنا کر اُسے نزاکت سے محروم کر دیا ہے۔ اُس کی گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ، آزادی کی چکا چوند سے مرعوب کر کے دگنی ذمہ داری اُس کے ناتواں کندھوں پر ڈال دی ہے جب کہ عورت کا اصل مقام گھر اور اُس کا اصل مصرف صرف عورت ہونا ہے۔ اقبال کے تصورِ عورت کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین یوں رقم طراز ہیں:

''اقبال کا خیال ہے کہ اگر عورت کی فطرت سیاست و معیشت کی آلودگیوں میں پھنسے گی تو وہ اپنا نسوانی جوہر کھو دے گی جو اُس کا منشاء وجود ہے وہ کہتا ہے کہ عورت کا نصب العین یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ افلاطون کے سے مکالمات لکھے اور اپنے علم و فضل کا سکہ بٹھائے بلکہ یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کی ماں بنے جو افلاطون کے سے مکالمات لکھ سکے۔'' (۱۵)

مندرجہ بالا سطور کی بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کی نگاہ عصرِ حاضر کے مسائل اور اُن کے حل کے لیے ایک جدید انسان کی تلاش میں ہے جو ایمان کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں کو بھی پورا کرے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جہانبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے اپنے نفس پر بھی قابو رکھے اور انسانیت کے اس اعلیٰ مقام تک پہنچے جس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین کے خیال میں ''اقبال کی زندگی میں مشرق و مغرب کے علم و حکمت کے دھارے آ کر مل گئے تھے اُس نے عہدِ جدید کے انسان کا جو تصور پیش کیا ہے جسے وہ مردِ مومن کہتا ہے۔ وہ ایسا جاندار تصور ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔'' (۱۶)

## حوالہ جات


۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مضمون، ہائیڈ گر کا "اتھینٹك مرد" اور اقبال کا مردِ مومن"، مشمولہ "فنون"، لاہور، شمارہ۱۹، ۱۹۸۳ء، ص:۱۶۱

۲۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر، بالِ جبریل، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۸ء، طبع دہم)، ص:۱۷۷

۳۔ ممتاز شیریں، منٹو نوری نہ ناری، مرتب: آصف فرخی، (کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۵ء)، ص:۱۴۲

۴۔ عاصمہ وقار، مرتب، مجموعہ تنقیدات آل احمد سرور، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص:۶۹

۵۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نگر، مرتبہ: شیما مجید، (لاہور: جنگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص:۶۱۰

۶۔ محمد حسنین سیدؒ، جوہرِ اقبال، (نئی دہلی: ملی پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص:۱۹۸

۷۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکرِ اقبال، (لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۶۱ء، بارِ دوم)، ص۲۸۵

۸۔ محمد حسنین سیدؒ، جوہرِ اقبال، ص:۲۰۲

۹۔ مظفر علی سید، یادوں کی سرگم، (لاہور: شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، سویرا آرٹ پریس، ۲۰۰۷ء)، ص:۱۷

۱۰۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، اقبال شناسی کا ایک مختلف زاویہ، مشمولہ: راوی، (لاہور: جی سی یونیورسٹی، ۲۰۱۱ء)، ص:۱۱۳

۱۱۔ سعید احمد رفیق، اقبال کا نظریہ اخلاق، (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۷۷ء، طبع ثانی)، ص:۷۴تا۷۵

۱۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مسائلِ اقبال، (لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، ۱۹۴۷ء)، ص:۲۶۸

۱۳۔ عبدالحق، ڈاکٹر، تنقید اقبال اور دوسرے مضامین، (دہلی: شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی، جمال پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۲ء)، ص:۹۱

۱۴۔ رشید احمد انگوی، تلقینِ اقبال، (لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۰ء)، ص:۱۵۰تا۱۵۱

۱۵۔ یوسف حسین، ڈاکٹر، روح اقبال، (دہلی: مکتبہ جامع اُردو، ۱۹۶۶ء، طبع ششم)، ص:۲۹۹

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۲